ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.1(2024)
(January to March)

مختار صدیقی کے دو علمی تراجم: تحقیق و تجزیہ

Two Scholarly Translations by Mukhtar Siddiqui: Research and Analysis

ڈاکٹر محمد ابو بکر فاروقی
لیکچرر، شعبہ اُردو، یونی ورسٹی آف گجرات، گجرات
ڈاکٹر توقیر اشرف
ڈپٹی کنٹرولر، یونی ورسٹی آف گجرات، گجرات

Dr. Abu Baker Farooqi
Lecturer, Department of Urdu, University of Gujrat, Gujrat
Dr. Tauqir Ashraf
Deputy Controller, University of Gujrat, Gujrat

Abstract:
Mukhtar Siddiqui, even though famous for being a poet, wrote radio plays, essays on history and literary criticism as well. None the less, the literary world remained unaware of his creative and academic translations. In this paper, two of his translations have been analysed to foreground not only their importance but also Mukhtar Siddiqui's contribution to literature. In the 20th century, the pace of Urdu translations became more rapid and our writers participated in it. Mukhtar Siddiqui as a poet holds an important position in modern Urdu poetry. His awareness of the political, social and international movements of his time distinguishes his poetry among the poets of Arbab-e-Zauq circle; Besides, his interest in music and ragas gives his poems a different dimension.

Keywords: Mukhtar Siddiqui, literary criticism, literature, Urdu translations, Urdu poetry, Arbab-e-Zauq circle, different dimension

اُردو میں ادبی تراجم کی بہ نسبت علمی تراجم کی روایت کافی کم زور رہی ہے؛ خاص طور پر اُردو ادیبوں کے ہاں اس نوع کے تراجم بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ اصل میں اس کی سب سے بڑی وجہ تو مجموعی علمی صورتِ حال ہے؛ جب کسی معاشرے میں علوم کو وہ اہمیت نہ دی جائے جو ترقی یافتہ معاشروں اور اُن کی زبانوں میں دی جاتی ہے تو وہاں علمی تراجم بھی کم ہی ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ تکنیکی ہے جو پہلی وجہ سے بہر حال جڑی ہوئی ہے کہ علمی تراجم کے لیے مخصوص اصطلاحات کے مفہوم سے کسی بھی مترجم کی آگاہی ضروری ہے لیکن جب علوم عام نہیں ہوں گے، اُن کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست نہیں ہوتا تو اصطلاحات کی تفہیم بھی نہیں ہوتی۔ ایسے مترجمین مشکل سے ملتے ہیں جو اصطلاحات کا فہم رکھتے ہیں لہٰذا علمی تراجم کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں رہتی۔ یہاں سب سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ ترجمہ کسی زبان اور تہذیب کے لیے کس قدر ضروری اور اہم ہوتا ہے۔ گو اس ضمن میں ہم صفحوں کے صفحے لکھ

سکتے ہیں لیکن یہاں جیلانی کامران کا اقتباس کافی ہے جس میں بہت سے اہم نقاط یک جا ہو کر ترجمے کی اہمیت کو اُجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ترجمہ جہاں الفاظ کے ذریعے انسانی علوم میں اضافہ کرتا ہے اور ذہن کی سرحدوں کو کشادہ کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس میں ترجمے کی تمدنی اور ثقافتی ضرورت بھی مضمر ہوتی ہے، وہاں ترجمے کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ خیالات اور جذبات کو بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب مل جاتے ہیں۔ نئے الفاظ وضع کرنا پڑتے ہیں۔ پرانے الفاظ کو دوبارہ استعمال کرنے سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ نئے محاورے اور نئے محرکات دستیاب ہوتے ہیں اور نئے علوم سے آشنائی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں نئی نئی اصناف کے ساتھ ذہن کا تعارف ہوتا ہے۔ اور فکر اور تحقیق کے لیے نئے سانچے، اور نئے اسالیب مل جاتے ہیں۔"(۱)

اصل میں اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسانوں کے درمیان باہمی رابطے اور اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ زبانوں کے فرق کی رہی ہے۔ اس فرق کو دُور کرنے کے لیے انسان کے علم کو بنی نوع انسان کی مشترک میراث بنانے میں ترجمے نے جو اہم کردار ادا کیا ہے انسانی تہذیب کی ترقی اس کی شاہد ہے۔ بے شک ترجمہ نے ہی ایک قوم کے علم کو دوسری قوموں تک پہنچایا ہے۔ علم کے اس ذخیرے میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا ہے ترجمے کی رفتار میں بھی تیزی آتی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ درست ہے کہ انسانی علوم کو فروغ دینے میں ترجمہ ایک اہم ترین محرک رہا ہے گو دیگر اسباب کی کارفرمائی سے انکار نہیں لیکن ترجمے نے شاید ان سب میں سب سے زیادہ کردار ادا کیا ہے۔ اسی لیے کچھ مترجمین اور مفکرین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ اگر آپ کے پاس اچھے تراجم یا مترجمین نہیں ہیں تو آپ کا معاشرہ ایک طرح سے جہنم رسیدہ ہے۔ اس سلسلے میں معروف ہندی انگریزی لکھاری امیتاؤ گھوش (Amitav Ghosh) کا تو ایک واضح موقف ہے، وہ صاف صاف لکھتا ہے:

> "And the thing about translation is that there is no way around it. In a country as multilingual as ours, unless you have really good translations, you are doomed.(2)

کرۂ ارض کے سکڑنے اور دنیا کے گاؤں بننے سے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ جب ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک ہوئے ہیں تو ترجمے کی اہمیت اور ضرورت زیادہ ہو گئی ہے۔ پہلے زمانوں میں ایک زبان کے لوگ ایک ساتھ رہتے تھے جنھیں ایک دوسرے کی زبان کے ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی؛ اب دنیا ایسی نہیں رہی۔ اب تو مختلف زبانیں بولنے والے لوگ ہر لمحہ قریب ہو رہے ہیں ایسے میں ایک دوسرے کے ساتھ ابلاغ کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہر کوئی ہر دوسری زبان کو سیکھے یا زبانوں کے تراجم ہوں، جن کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پال اینگل (Paul Engle) ترجمہ نگاری کو صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں کرۂ ارض پر موجود دیگر مخلوقات کے لیے بھی ضروری خیال کرتا ہے۔ اُس کا ماننا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کسی دن ترجمہ اس قدر ناگزیر ہو جائے کہ کہا جائے کہ "ترجمہ کرو! یا مر جاؤ!"۔ اُس کے الفاظ ہیں:

> "As this world shrinks together like an aging orange and all people in all cultures move closer together (however reluctantly and suspiciously) it may be that the crucial sentence for our remaining years on earth may be very simply:
> Translate! Or Die.

The lives of every creature on the earth may one day depend on the instant and accurate translation of one world."(3)

پال اینگل کی بات بہ ظاہر کچھ عجیب اور انوکھی لگتی ہے مگر ایسا ہونا ممکن ہے اگر ہم تیزی سے سکڑتی ہوئی بین اللسانی دنیا کا ادراک کر سکیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی ایک دن ایسا آسکتا ہے۔ ایک اہم بات یہاں اور قابلِ توجہ ہے کہ یہ ترجمے کا فن ہی ہے جس نے مفکرین کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ کوئی ایسی واحد قدیم زبان ضرور ہو گی جو پہلے پہل مشترکہ انسانی ورثہ رہی ہے اور جسے ہم ام الالسنہ بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اُس کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا جا سکے اور اُسے سمجھا بھی جا سکے۔ یہ تحقیقات فنِ ترجمہ پر غور و فکر سے ہی سامنے آئیں اور اس میں سب سے زیادہ امریکی دانش ور نوم چامسکی کی تحقیقات کا عمل دخل ہے جس نے ایک آفاقی زبان کا تصور دیا۔ ہمارے ہاں اس کی بھرپور وضاحت شمس الرحمن فاروقی نے کی۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

"ترجمے کے بارے میں سوالات اور مسائل کا گہرا تعلق زبان کی اصل اور نوعیت کے بارے میں سوالات سے ہے۔ اگر کوئی ایسی واحد قدیمی زبان نہیں تھی جسے ہم ام الالسنہ کہہ سکیں، اور اگر ہر زبان اپنی جگہ بے عدیل و بے نظیر ہے، تب تو ترجمہ ناممکن ہے۔ چوں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی نہ کسی طرح کا ترجمہ ممکن ہے اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کبھی کوئی قدیمی، آفاقی ام الالسنہ تھی جس نے اپنے نشان بعد کی تمام زبانوں میں چھوڑے ہیں، اور اسی باعث یہ ممکن ہو سکا کہ انسان اپنے تجربات کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں اور اپنے خیالات کی ترسیل دوسروں تک کر سکتے ہیں۔ چامسکی (Choumsky) اسی نظریے کا موید معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس نظریے کی رُو سے کسی آفاقی تبدلاتی Transformational گرامر کے وجود کا بھی امکان پیدا ہوتا ہے۔ چامسکی کہتا ہے کہ 'انسانی دماغوں میں ایک نظامِ قوائد مشترک ہے اور یہی نظامِ قوائد ہمارے لیے یہ بات ممکن بناتا ہے کہ ہم لامتناہی پھیلاؤ کے اندر واقع ہونے والے فقروں کو اپنے اندر وصول کرنے (Process) اور ان کی تعبیر کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔"(۴)

ان سب باتوں سے ہم اتنا ضرور جان لیتے ہیں کہ تراجم نہ صرف کسی سماج اور قوم کے لیے ضروری ہوتے ہیں بلکہ ممکن بھی ہوتے ہیں اور وہی قومیں علمی اور ادبی ترقی میں آگے بڑھ سکتی ہیں جو ترجمے سے اپنے آپ کو مسلسل وابستہ رکھتی ہیں۔ اُردو زبان نے اس میں شک نہیں کہ تراجم سے اپنا سلسلہ انیسویں اور بیسویں صدی میں تیزی سے جوڑا گو علمی تراجم کی روایت قدرے کم زور رہی لیکن مجموعی طور پر تراجم کا سلسلہ مضبوط رہا۔ اس سے اُردو زبان و ادب نے نہ صرف خیالات اور نظریات کے خزانے کو اپنی زبان میں ڈھالا بلکہ نئے اسالیب اور اظہار کے نئے پیرائے بھی اخذ کیے جس سے اُردو زبان میں ہر طرح سے وسعت پیدا ہوئی۔ اُردو زبان میں خیالات کی ترسیل کا نظام بھی بہتر ہوا اور مناسب الفاظ کے استعمال کا سلیقہ بھی آیا اور ڈکشن میں بھی اضافہ ہوا۔ اس ذیل میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا:

"اُردو میں مغربی زبانوں سے ادبی تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اُردو زبان و ادب کی وسعت اور تکنیکی سطحوں پر گہرائی و گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ

تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا، نئے طرزِ احساس کو اُبھارا، پیرایہ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال کو بڑھاوا دیا اور پیرائیہ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے۔"(۵)

اس میں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ اُردو میں علمی تراجم نے اس زبان کو جدید دنیا سے جوڑنے کا بھی اہم کام کیا۔ اُردو زبان میں بین الاقوامی ذہن اس زبان میں ہونے والے تراجم کی بدولت پیدا ہوا جس نے اپنے اِرد گرد کی ترقی یافتہ دنیا کا ادراک اپنے سے پہلے والی نسلوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر انداز سے کیا۔

بیسویں صدی میں اُردو کے تراجم کی رفتار زیادہ تیز ہوئی اور اس میں ہمارے ادبا نے بھرپور حصہ لیا۔ مختار صدیقی بہ طور شاعر اُردو کی جدید شاعری میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور بین الاقوامی تحریکوں سے آگاہی اُن کی شاعری کو حلقۂ اربابِ ذوق کے شاعروں میں ممتاز کرتی ہے؛ علاوہ ازیں موسیقیت اور راگوں سے دلچسپی، اُن کی نظموں کو ایک الگ جہت عطا کرتی ہے۔ لیکن مختار صدیقی نے شاعری کے علاوہ دیگر میدانوں میں بھی قابلِ قدر کام کیا ہے، جو بالعموم ہماری نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ اُنھوں نے ریڈیو کے لیے متعدد ڈرامے لکھے، تاریخ سے دلچسپی ہونے کی وجہ سے تاریخی مضامین بھی تحریر کیے اور ادبی تنقید بھی لکھی؛ اور ان سب سے بڑھ کر اُردو تراجم بھی کیے جن میں تخلیقی اور غیر تخلیقی یا علمی؛ دونوں طرح کے تراجم شامل ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حمیرا اشفاق رقم طراز ہیں:

"مختار صدیقی کی ایک اور جہت بہ طور نثر نگار کے بھی ہے۔ اُنھوں نے افسانوی اور غیر افسانوی دونوں طرح کا ادب تخلیق کیا۔ اُنھوں نے تنقید اور تراجم میں بھی معنی کے نئے جہان پیدا کیے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ مختار صدیقی ادب کی تنقید کرتے ہوئے غیر جانب داری اور علمیت کی ایسی ارفع سطح پر موجود ہوتے ہیں جو ایک ناقد کی بنیادی خصوصیت ہونی چاہیے۔ تراجم کو بھی اس طور نبھایا کہ اُسے تخلیقی رنگ عطا کر دیا۔"(۶)

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ ہمارے ہاں ادیبوں اور شاعروں میں ادبی اور تخلیقی تراجم کی روایت تو کافی مضبوط دکھائی دیتی ہے مگر علمی تراجم کی روایت کچھ زیادہ توانا نہیں۔ ایسے میں مختار صدیقی کے دو ایسے علمی تراجم ملتے ہیں جنھوں نے نہ صرف ۶۰ء اور ۷۰ء کی دہائی کی نسل کو فکری سطح پر متاثر کیا بلکہ آج بھی ان تراجم کا مطالعہ اُتنا ہی ضروری ہے جتنا آج سے پچاس سال پہلے ضروری تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ اِن کی مقرر اشاعت کو ہمارے اشاعتی اداروں نے ضروری خیال کیا ہے۔

مختار صدیقی نے جو دو علمی تراجم کیے اُن میں ایک کتاب چینی مفکر ڈاکٹر لین یو تانگ کی "The Importance of Living" ہے، جس کا اُنھوں نے "جینے کی اہمیت" کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں ترجمہ کیا؛ جب کہ دوسری کتاب معروف فرانسیسی مصنف آندرے موروا کی "The Art of Living" ہے جس کا مختار صدیقی نے "جینے کا قرینہ" کے عنوان سے ۱۹۶۳ء میں ترجمہ کیا۔ یہ دو کتابیں نیم فلسفیانہ انداز سے اپنے قاری کو زندگی کی چند انمول حقیقتوں سے صرف آگاہ ہی نہیں کرتیں، اُنھیں جینے کا حوصلہ اور زندگی کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی بناتی ہیں۔

ان دو تراجم کے بارے میں ایک مکالمے کے دوران ایم۔ خالد فیاض نے دو اہم نقاط کی طرف خوبی سے اشارہ کیا کہ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو گا کہ مختار صدیقی نے یہاں ایک مشرقی مفکر کی کتاب لی ہے اور دوسری مغربی مصنف کی؛ لیکن دونوں کا بنیادی

موضوع زندگی ہے، جس کی وجہ سے ان دو کتابوں کے مطالعے سے ہم بیک وقت زندگی کے بارے میں مشرقی اور مغربی نقطۂ نظر سے واقف ہوتے ہیں۔(۷) اِسے مختار صدیقی کا کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اِن کتابوں کے تراجم سے ایسا ہو ضرور گیا ہے۔

''جینے کی اہمیت'' اگرچہ اُردو میں پہلی بار ۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آئی لیکن چینی زبان میں پہلی بار یہ ۱۹۳۷ء کو شائع ہوئی(۸) یہ وہ دَور ہے جب دنیا دوسری عالمی جنگ کے ذریعے انسان اور انسانی خوشیوں کی تباہی کے لیے پَر تول رہی تھی۔ ایسے میں اس کتاب کا مطالعہ انسان پرست اور زندگی سے محبت کرنے والوں کے لیے بہت ضروری تھا کہ وہ امن اور انسانیت کے لیے کچھ سوچ سکیں۔ بہر حال اس کتاب کو لین یو تانگ نے چودہ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب زندگی اور جینے کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ پوری کتاب بقول ڈاکٹر انعام الحق جاوید یہ ثابت کرتی ہے کہ:

> "چینی فلسفہ سادہ اور عام ہے۔ سامنے کی زندگی کا بیان فلسفیانہ موشگافیوں، نظری بحثوں اور ادق اصطلاحات سے پاک ہے؛ یہی وجہ ہے کہ یہ آپ کے سوچنے کے انداز کو بدل دیتا ہے۔ وہی واقعہ جس پر آپ کا موڈ خراب ہو سکتا ہے اگر ذہن اور سوچ کی سمت ذرا سی صحیح کر لی جائے تو وہی واقعہ آپ کے لیے مُسرت کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔"(۹)

یہی وجہ ہے کہ چاہے یہ سوال پیشِ نظر ہو کہ انسان کیا ہے؟ یا انسان پرستی کسے کہ سکتے ہیں؟ یا پھر زندگی سے کون زیادہ حظ اُٹھا سکتا ہے؟ ان سب پیچیدہ سوالوں کے ہمیں یہاں انتہائی سادگی سے بیان کیے گئے جوابات ملتے ہیں جو ہمیں اُلجھاتے نہیں بلکہ زندگی سے متعلق ہمارے فکر و خیال کو سُلجھاتے ہیں۔ یہ چینی فلسفے کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مصنف لین یو تانگ کو بھی اس سے انکار نہیں کہ وہ اپنی اس کتاب میں چینی نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے لیکن وہ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ چوں کہ انسان بنیادی طور پر ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایک ہی ہے اس لیے قدیم چینی دانش سب انسانوں کے لیے مفید ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "آئندہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا جائے گا وہ ایک چین کا نقطۂ نظر ہے۔ میں زندگی اور کائنات کے بارے میں وہی نقطۂ نظر پیش کرنے پر مجبور ہوں جو بہترین چینی دماغوں اور داناؤں کا نقطۂ نظر ہے اور جسے اُنھوں نے چین کی لوک کہانیوں اور چین کے ادب میں پیش کیا ہے۔۔۔ مجھے یہ احساس ہے کہ زندگی کے بارے میں یہ نقطۂ نظر بنیادی طور پر درست اور سچا ہے۔ انسان ہر جگہ اور ہر دَور میں ایک ہی ہے۔ رنگ اور نسل کے امتیازات محض ظاہری ہیں۔ جو بات ایک ملک میں بسنے والوں کے دلوں سے تعلق رکھتی ہے وہی بات دوسرے سب ملکوں کے باشندوں کے دلوں کی بات ہوتی ہے۔ میں زندگی کا وہ نقطۂ نظر پیش کروں گا جس کی تشکیل چینی شاعروں اور عالموں نے اپنی دانش، اپنی حقیقت پسندی اور اپنے ذوقِ سلیم سے کی تھی۔۔۔ جنھیں انسانی زندگی کی مجبوریوں اور پابندیوں کا شدید احساس تھا مگر جو یہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی ایک باوقار چیز ہے۔"(۱۰)

اسی بنیادی خیال کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے اور چودہ ابواب میں کرۂ ارض کے تمام انسانوں کے لیے دانش کی ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں جو اُن کے لیے زمان و مکان سے ماورا دلچسپی کا باعث ہیں۔ کمال یہ ہے کہ اُردو کے اس ترجمے میں ہمیں چینی فلسفے سے کوئی اجنبیت یا دُوری محسوس نہیں ہوتی۔ گو اس کا ایک پہلو وہ چینی فلسفہ ہے، سادگی جس کا بنیادی مسلک ہے لیکن دوسرا پہلو مختار صدیقی کے الفاظ کا ایسا چناؤ اور جملوں کی ایسی بُنت بھی ہے جو ہمیں ایک لمحے کے لیے اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتی۔ چینی فلسفہ جس قدر سادہ ہے مختار

صدیقی نے اُسی مناسبت سے اُردو کے اسلوب کو بھی سادہ اور شگفتہ رکھا ہے۔ بے شک مختار صدیقی نے اپنے ترجمے سے اس کتاب کے آفاقی موضوعات کو اُردو میں زندہ جاوید کر دیا۔ بقول ڈاکٹر حمیرا اشفاق:

> "لین یو تانگ کی کتاب جینے کی اہمیت؛ موضوع کے اعتبار سے ایک آفاقی کتاب ہے۔ اس میں بیان کردہ موضوعات تمام بنی نوع انسان سے متعلق ہیں وہ مسائل جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ہمیشہ سے تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس کتاب کے ترجمے نے اسے اور بھی سہل بنا دیا ہے۔ زندگی سے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑے مدلل اور مفکرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اپنے مؤقف کی تائید کے لیے چینی حکایتوں، واقعات اور ضرب الامثال کا بھی استعمال کیا گیا ہے جس نے کتاب کے حسن کو دوچند کر دیا ہے۔"(۱۱)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ موضوعات کون کون سے ہیں جن کا اس کتاب میں احاطہ کیا گیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں 'انسان کیا ہے؟'، 'انسان کا حیوانی ورثہ'، 'انسانیت پرستی'، 'زندگی سے کون حظ اُٹھاتا ہے؟'، 'زندگی کی نعمتیں'، 'فراغت کے مزے'، 'گھر گرہست کے مزے'، 'جینے کے مزے'، 'فطرت اور سفر کے مزے'، 'ثقافت کے مزے'، 'خدا سے ناتا' اور 'سوچنے کا فن' جیسے انتہائی اہم موضوعات ملتے ہیں۔ جن کے مطالعے سے ہماری فکری بالیدگی کا سامان تو فراہم ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ ہمیں ایک انسان کی زندگی کی اہمیت اور اُس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی بہ خوبی ہوتا ہے۔

> مثلاً 'انسان کیا ہے؟' کا موضوع ایک ایسا آفاقی موضوع ہے جس پر شاید ہی کسی مفکر نے غور نہ کیا ہو لیکن لین یو تانگ کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز جدا ہے۔ ایک حوصلہ دیتا ہوا انداز، قاری کے اندر ایک مثبت اندازِ فکر کو جلا دیتا ہوا اسلوب جو دل کش بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ ایک نمونہ دیکھیے:
>
> "آخر ہم خاک کے پتلے ہیں، خاک سے پیدا ہوئے ہیں، اور خاک ہی کے زندانی ہیں، اور یہ کوئی تاسف کی بات نہیں یہ غم فضول ہے کہ ہمیں اس حسین دنیا میں عارضی مہمانوں کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے۔ اگر یہ دنیا اتنی حسین نہ ہوتی اور محض ایک اندھیری کال کوٹھڑی ہوتی، تب بھی ہمیں یہاں بری بھلی بسر کرنا ہی تھی، لیکن اگر یہ دنیا کال کوٹھڑی کے بجائے ایک خوب صورت جگہ ہے اور اس میں ہمیں ایک صدی کا بڑا حصہ رہنے کی اجازت مل گئی ہے تو زندگی اچھی نہ گزارنا سخت ناشکری ہوگی۔"(۱۲)

اس سے پہلے لین یو تانگ انسان اور انسانیت کے بارے میں مسیحی، یونانی اور چینی تصورات کا ایک خاکہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس میں چینی نقطۂ نظر ہمارے لیے بہت دلچسپی کا باعث ہے کہ اس تصور سے ہم پہلے کہیں آگاہ نہیں ہوتے۔ لین یو تانگ کے بقول چینی نقطۂ نظر کے مطابق "انسان، مخلوقات کا بادشاہ ہے۔۔۔ کنفیوشس کا تو یہ خیال ہے کہ عالم اسباب میں انسان کا مرتبہ آسمان اور زمین کے برابر ہے۔ اس نظریے کا پس منظر یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر شے زندہ ہے اور یا اس میں روح ضرور موجود ہے۔"(۱۳) ایسے خیالات معلومات افزا بھی ہیں اور زندگی کو نئے سرے سے سوچنے پر مجبور بھی کرتے ہیں۔

''سوچنے کا فن'' کے عنوان سے اگرچہ پورا باب نہایت دلچسپ اور غور طلب ہے لیکن وہ سطور جن میں لین یو تانگ نے منطقی اور معقول آدمی میں فرق کیا ہے، ہمارے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث ہے کیوں کہ بالعموم ہم ان دو کو ایک ہی سمجھتے ہیں، لیکن لین یو تانگ نے ان میں جو فرق کیا ہے وہ آج کی دنیا میں متعارف ہونا بہت ضروری ہے جس سے منطقی آدمی دوبارہ سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو سکتا ہے اور سوچنے کے انداز میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ لین یو تانگ کے اس ضمن میں الفاظ دیکھیے:

> "تفکر میں انسان پرستی جس چیز کو کہتے ہیں وہ اصل میں معقول سوچ کا دوسرا نام ہے۔ منطقی آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ انسان نہیں ہوتا اور اسی لیے وہ ہر بات میں غلط ہوتا ہے۔ برعکس اس کے معقول آدمی کا یہ شیوہ ہے اُسے ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں میں ہی غلطی پر نہ ہوں۔ اسی لیے وہ ہمیشہ ٹھیک بھی ہوتا ہے۔۔۔ اصل میں معقول مفکر وہی ہے جو کسی دعوے کو لمبی چوڑی دلیلوں سے ثابت کرتے کرتے یکایک یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی دلیلیں غلط ہیں اور اس عملی سوجھ بوجھ کا وہ یوں مظاہرہ کرتا ہے کہ یکایک اپنی غلطی مان لیتا ہے اور اپنی ساری پیش کردہ دلیلوں کو اس طور آن واحد میں ایک فقرے سے فنا کر دیتا ہے۔''(۱۴)

اصل میں لین یو تانگ جو بات ہمیں سمجھانا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل آدمی وہ ہے جو محض خشک قسم کی منطقی دلیلوں کی ہی بنیاد پر نہیں بلکہ انسانی جذبوں اور احساسات کی سچائی کا اقرار بھی کرتا ہے؛ سوچنے کا فن یہی نہیں کہ آپ نے منطقی اور استدلالی بنیادوں پر کیا سوچا بلکہ آپ نے جذبات اور احساسات کو کیسے سمجھا؛ یہ طے کرتا ہے کہ آپ کس قدر بہتر سوچنا جانتے ہیں۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ ''ذہنِ انسانی کا یہ فرض نہیں کہ بڑی احمقانہ قسم کی منطقی دلیلیں گھڑ گھڑ کر حاضر کرتا رہے بلکہ ذہنِ انسانی کا کام یہ ہے کہ انسانی خواہشوں، جذبوں اور من کی موج کے ہر آن بدلتے ہوئے اور آپس میں ٹکراتے ہوئے طوفانوں کے درمیان توازن قائم رکھے۔۔۔ (کیوں کہ) منطق کی کڑی سے کڑی اور لاجواب سے لاجواب دلیل کا جواب حلم اور بردباری، شفقت اور محبت سے دیا جا سکتا ہے، منطقی جواز کو محبت بالکل ہیچ ثابت کر سکتی ہے۔''(۱۵) اور یہ بات درست بھی ہے کہ عام مشاہدے میں انسانی معاملوں میں غیر منطقی طور طریقے اکثر دل فریب ہوتے ہیں۔

غرض یہ کہ اس کتاب میں لین یو تانگ جینے کی اہمیت کو پوری طرح بیان کرتا ہے اس ضمن میں کتاب کا آخری اقتباس جو اختتامیہ ہے اس قدر دل کش اور معنی افروز ہے کہ اُس کا کوئی جواب نہیں۔ اس اختتامی اقتباس کا ترجمہ بھی مختار صدیقی نے جس بے ساختگی سے کیا ہے وہ بھی قابلِ داد ہے۔ دیکھیے:

> "گویا جینا اور صرف جینا ہی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ بات اتنی عیاں اور واضح ہے کہ ہمیں اس کا کبھی خیال نہیں ہوتا بلکہ پُرامن زندگی کے دنوں میں تو ہم اس بات کو مشکوک بھی سمجھتے ہیں اور اس پر اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ اخلاقی قدروں کے علم بردار عام طور پر بے کار لیٹے رہنے کو سخت تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مذہبی رہنماؤں کا تو یہ حال ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنے آپ کو تکلیف دینا بہت بڑی نیکی اور سعادت سمجھتے رہے لیکن محاذ جنگ پر جو سپاہی لڑ رہا ہو اُسے ایک نہ ایک دن یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ بستر پر بے کار پڑے رہنا تہذیب کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور بستر پر لیٹ کر مرنا، کمربستہ ہو کر لڑائی میں باوردی مرنے سے زندگی کا کہیں زیادہ عمدہ انجام ہے۔''(۱۶)

یہ وہ کتاب ہے جسے اُردو کے اُس وقت کے قارئین کی ایک کثیر تعداد نے تو پڑھا ہی تھا لیکن کمال یہ ہے کہ اس کی اہمیت میں آج بھی کمی نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نئے ایڈیشن اچھی خاصی تعداد میں بعد میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔

۱۹۶۳ء میں آندرے موروا کی کتاب کا مختار صدیقی کا کیا ہوا ترجمہ "جینے کا قرینہ" منظر عام پر آیا تو انسانی زندگی اور اُسے جینے کے کچھ اور راز عیاں ہوئے۔ یہاں اس کتاب کے مطالعے سے زندگی کرنے کا سلیقہ اور قرینہ سیکھنے کے ساتھ ساتھ زندگی کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ آندرے موروا نے اپنی اس کتاب میں نَو مضامین پیش کیے ہیں جو "محبت"، "شادی"، "گرہست"، "دوستی"، "غور و فکر"، "کام"، "قیادت"، "بڑھاپا" اور "مسرت" جیسے عنوانات سے مزین ہیں۔ اِن میں موروا نے بڑی سہولت سے ان موضوعات کا احاطہ کیا ہے اور باوجود اس کے کہ یہ کتاب بنیادی طور پر مغربی معاشرے کی زندگی اور ماحول کے پس منظر میں لکھی گئی ہے لیکن حیرت انگیز طور پر یہاں بھی ہمیں یہ خصوصیت نظر آتی ہے کہ موروا اس میں پیش کیے گئے موضوعات کو زمان و مکان سے ماورا ہو کر بیان کرتا ہے اسی لیے اِن مضامین سے دنیا کا کوئی بھی فرد فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ گو آندرے موروا نے اس کا دعویٰ کہیں نہیں کیا اور نہ مختار صدیقی نے اس بارے میں کوئی روشنی ڈالی ہے لیکن ان مضامین کا مطالعہ یہ سب بتا دیتا ہے۔ مختار صدیقی کا اس کتاب کا ترجمہ کس پائے کا ہے اس کا اندازہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "مختار صدیقی نے اس کتاب (جینے کا قرینہ) کو شہرۂ آفاق بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان کے ترجمے نے تخلیق کار کے خیالات کو ہمارے معاشرے میں من و عن بیان کر دیا ہے لیکن پڑھتے ہوئے ترجمے والی رکاوٹ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ ترجمے کی روانی اور تسلسل اس کتاب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس ترجمے کو مختار صدیقی نے تخلیقی ترجمہ بنا دیا ہے۔"(۱۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک جگہ کہ رکھا ہے کہ "مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ دوسری زبان کے اظہار کو اپنی زبان کے اظہار سے قریب تر لائے اور مصنف کے لہجے اور طرزِ ادا سے اپنی زبان میں ایک نئے اسلوب کے لیے راہ ہموار کرے۔"(۱۸) اس کتاب میں مختار صدیقی کے ترجمے کی یہی خصوصیت عیاں ہے۔ فرانسیسی مصنف کے خیالات کو اُردو کا ایسا جامہ پہنایا ہے کہ اُردو کو ایک نیا اسلوب ملتا نظر آتا ہے۔ یوں تو یہاں بے شمار مثالیں اس ذیل میں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن فی الوقت ایک مضمون "غور و فکر" کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جہاں مختار صدیقی مندرجہ بالا ہنر کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

> "میرے خیالوں کی اُدھیڑ بن میں میرے سامنے اور میرے حال کی باتیں ہی نہیں دُور دراز کے ملکوں کے سپنے بھی ہیں، قدیم زمانے کے واقعات کی بعض جھلکیاں بھی ہیں۔ اور ان کے علاوہ نامعلوم مستقبل کے بارے میں چند اندازے چند نظریے بھی ہیں۔ گویا میرا ذہن ایک چھوٹی سی داخلی دنیا ہے جس کے آئینہ خانے میں، باہر کی وسیع دنیا کے پرتو منعکس ہوتے ہیں۔ مگر اس میں زمان و مکان کے تعینات نہیں ہوتے۔"(۱۹)

یہ مضمون مصنف کے دیگر مضامین کی بہ نسبت مشکل مضمون ہے کیوں کہ اس میں مصنف نے داخلی اور خارجی دنیا کے مسائل کو خالص فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے لہٰذا یہاں "مترجم کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس گنجلک بحث کو بھی بآسانی دوسری زبان میں خیال کی صداقت کے ساتھ منتقل کر دیتا ہے۔"(۲۰) جو آسان کام نہیں۔

آندرے موروا کے تمام مضامین فکری حوالے سے کہیں ثقیل تو کہیں قدرے ہلکے پھلکے انداز کو اپناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آندرے موروا اصل میں دونوں طرح کا اسلوب بہ یک وقت قائم رکھنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ مختار صدیقی ترجمے میں بھی اس صفت کو لے کر چلنے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ جہاں مشکل اور ادق اسلوب ہے وہاں اُردو پیرائیہ بھی اُسی مناسبت سے برتا گیا ہے اور جہاں شگفتگی کا پہلو غالب ہے وہاں مختار صدیقی بھی وہی اسلوب اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک مضمون ''محبت'' ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے کافی اہم بھی ہے اُس کا ایک اقتباس دیکھیے جہاں مختار صدیقی کا ترجمہ بولتا ہے۔

> "حقیقت ہے کہ اتفاقات، کسی مرد اور عورت کو اتنا اختیار ہی نہیں دیتے کہ وہ اپنے جیون ساتھی کا پورے طور پر اپنی مرضی اور سوچ سمجھ سے انتخاب کرے۔ اور اسی میں انسان کی عافیت بھی ہے کیوں کہ انسانی جبلت، انسانی ذہانت سے زیادہ قابلِ اعتبار چیز ہے۔ اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا کہ کیا 'میرے لیے محبت کرنا ضروری ہے؟' بالکل تحصیلِ حاصل ہے۔ اس کا جواب تو از خود دل میں پیدا ہونا چاہیے۔ ہر پیدائش کی طرح محبت کی پیدائش بھی قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ محبت کرنے کا فن بعد میں آتا ہے اور ہمیں بڑی احتیاط سے اس لمحے کا تعین کرنا چاہیے، جہاں سے محبت میں ہمیں فن کار کی حیثیت اختیار کرنی چاہیے اور ایک فن کار کی طرح فطرت کے عطا کردہ خام مواد کو اپنی من مانی صورت دینی چاہیے۔"(۲۱)

آندرے موروا عام سوچ سے ہٹ کر باتیں کرتا ہے۔ چاہے وہ محبت ہو، دوستی ہو یا مسرت ہو؛ وہ ہماری عمومی سوچ سے الگ بات کرتا ہے جو ہمیں بہ ظاہر دھچکا تو دیتی ہے مگر وہ غلط نہیں ہوتی شاید ہمارے وہ معیار غلط ہوتے ہیں جو ہم نے بنا لیے ہیں۔ ایک جگہ وہ مرد اور عورت کی دوستی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ''یہ فرض کر لینا کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان جسمانی خواہش کی بنیاد کے بغیر، دوستی کے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے؛ بڑی تنگ نظری ہے۔ دونوں جنسوں کے درمیان ذہنی سطح پر میل جول نہ صرف ممکن ہے، بلکہ مردوں کے مقابلے میں آسان تر بھی ہے۔''(۲۲) جب کہ ہماری عمومی سوچ اس سے زیادہ آگے جاتی ہی نہیں کہ مرد عورت کی دوستی جسمانی خواہشات کا اظہار یا وجہ ہوتی ہے۔

اس کتاب کا سب سے اہم مضمون ''بڑھاپا'' ہے جس میں موروا نے انسان کی بڑھتی عمر اور اُس کے انسانی جسم اور روح پر پڑنے والے اثرات کا بڑی دردمندی سے جائزہ لیا ہے اور مختار صدیقی کے ترجمے میں بھی وہی دردمندی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ مضمون دردمندی کی مثال کے ساتھ ساتھ بصیرت افروز بھی ہے خاص طور پر بڑھتی ہوئی عمر کے ہر فرد کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس مضمون میں سے یہ ایک اقتباس اس کی اہمیت کا اندازہ دلانے کے لیے کافی ہے، دیکھیے:

> "بڑھاپا، سفید بالوں اور جھُریوں کا نام نہیں، بڑھاپا اس احساس کو نہیں کہتے کہ اب میرا وقت لد گیا اور دنیا کی اسٹیج نئی پود کے لیے ہے، میرے لیے نہیں۔ اصل خرابی جسم کی بڑھتی ہوئی نقاہت یا قواء کا اضمحلال نہیں ہوتا۔ اصل خرابی یہ ہوتی ہے کہ ہماری روح ہر چیز سے بے تعلق سی ہو جاتی ہے۔ گویا، پچاس کے پیٹے میں پہنچ کر، خواہشِ عمل مر جاتی ہے، قوتِ عمل برقرار رہے تو رہے۔ بھلا پچاس برس کے گوناگوں تجربوں اور ناکامیوں کے بعد یہ ممکن ہے کہ انسان میں نوجوانی کا سا ذوق و شوق باقی رہے؟ اس میں ہر شے کو سمجھنے کی خواہش بے دار رہے؟ دل اور روح کی پوری شدت اور

گہرائی کے ساتھ وہ محبت بھی کر سکے؟ کیا اس عمر کو پہنچ کر انسان کو یہ یقین باقی رہتا ہے کہ حسن و عشق اور ذہانت کا ازلی اور ابدی سمبندھ ہوا کرتا ہے؟ کیا عمر کے اس دَور میں انسان معقولات پر اپنا ایمان قائم رکھ سکتا ہے؟ پچاس برس کی سرحد سے آگے ایک ایسی دنیا شروع ہوتی ہے، جہاں خواہشوں کی چمک دمک تجربے کی آنکھوں کے لیے خیرہ کن نہیں ہوتی اور اشیا اور انسان دونوں اپنے اصلی رنگ میں نظر آتے ہیں۔"(۲۳)

اِن نَو مضامین میں آندرے موروا نے زندگی کے مختلف معاملات کو تنقیدی اور تجزیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا اور اپنا ایک مؤقف پیش کیا ہے۔ مختار صدیقی کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے کہیں اس کو بے کیف یا بدمزا ہونے نہیں دیا۔ خشک معاملات کو بھی اسلوب کی چاشنی سے دلکش بنالیا ہے۔ علاوہ ازیں اس ترجمے میں مختار صدیقی نے حواشی سے بھی کام لیا ہے جہاں اُردو شعرا کے اشعار کوٹ کر کے مصنف کے مفہوم کو واضح کرنے میں معاونت ملی ہے۔ اسی کے ساتھ آخر میں "حوالوں" کے ذیل میں ان مضامین میں ذکر کیے گئے مختلف فلسفیوں، مفکروں اور ادیبوں کا مختصر تعارف بھی دے دیا ہے تاکہ کوئی ابہام پنپنے نہ پائے۔

ول ڈیورانٹ کی ایک معروف کتاب "The Story of Philosophy" کا جب سیّد عابد علی عابد نے اُردو ترجمہ "داستانِ فلسفہ" کے عنوان سے کیا تو "پیش لفظ" میں ایک جگہ لکھا کہ "ایسی کتابیں اُردو میں میسر نہیں ہوتیں، صرف ترجمے کی صورت میں ہاتھ لگتی ہیں۔"(۲۴) مختار صدیقی کے ان دو کتابوں کے تراجم کے بارے میں بھی یہ بات بلاشبہ کی جاسکتی ہے۔ ترجمہ کرتے وقت محض ترجمے کے معیار ہی کو قائم نہیں رکھنا ہوتا بلکہ جس متن کا ترجمہ کیا جارہا ہو اُس کا علمی یا ادبی حوالوں سے اعلیٰ ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ بقول ایم۔ خالد فیاض "ترجمے کے لیے ایک معیاری کتاب کا انتخاب بھی کسی مترجم کے لیے بہت ضروری ہوا کرتا ہے۔"(۲۵) مختار صدیقی نے تراجم کے لیے جن دو علمی کتابوں کا انتخاب کیا وہ اپنے مواد کے حوالے سے آج بھی انتہائی اہم کہی جاسکتی ہیں۔ اور پھر مختار صدیقی نے اپنے ترجمے سے اِنھیں اُردو میں بھی ایک دائمی حیثیت اور مقام عطا کر دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جیلانی کامران، پروفیسر، ترجمے کی ضرورت، (مشمولہ)، ترجمہ: روایت اور فن"، مرتب: ڈاکٹر نثار احمد قریشی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۳

2. Amitav Ghosh, "Indian Express", March 20, 1994, Quoted by Bijay Kumar Das, "A Handbook of Translation Studies", New Delhi, Atlantic Publishers, 2005, Page:80

3. Paul Engle, "Foreward, Writing from World War 11", Iowa University Press, 1985, Quoted by Bijay Kumar Das, "A Handbook of Translation Studies", New Delhi, Atlantic Publishers, 2005, Page:109

۴۔ فاروقی، شمس الرحمن: دریافت اور بازیافت"، مشمولہ "فنِ ترجمہ کاری"، مرتب: ڈاکٹر صفدر رشید، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص: ۲۸

۵۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، اُردو میں ترجمے کی روایت، (مشمولہ)، ترجمہ کا فن اور روایت، (مرتب)، ڈاکٹر قمر رئیس، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۹۱

۶۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، مختار صدیقی: نوکلاسیکی روایت کا ترجمان، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص:۸
۷۔ ایم۔ خالد فیاض، مختار صدیقی کے علمی تراجم: ایک مکالمہ، بمقام: میر ٹرسٹ لائبریری، گجرات، بتاریخ: ۲۲ نومبر ۲۰۲۲ء
۸۔ مختار صدیقی، (مترجم)، جینے کی اہمیت، از لین یو تانگ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۹ء، ص:۵۰۶
۹۔ انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، پیش گفتار، (مشمولہ)، ایضاً، ص:۹
۱۰۔ تانگ، لین یو: "جینے کی اہمیت"، مترجم: مختار صدیقی، ص:۱۱
۱۱۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، مختار صدیقی: نوکلاسیکی روایت کا ترجمان، ص:۶۶ تا ۶۷
۱۲۔ تانگ، لین یو، جینے کی اہمیت، مترجم: مختار صدیقی، ص:۳۶ تا ۳۷
۱۳۔ ایضاً، ص:۳۲
۱۴۔ ایضاً، ص:۵۰۱
۱۵۔ ایضاً، ص:۵۰۲
۱۶۔ ایضاً، ص:۵۱۴
۱۷۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، مختار صدیقی: نوکلاسیکی روایت کا ترجمان، ص:۵۹ تا ۶۰
۱۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ایلیٹ کے مضامین، کراچی، رائٹرز بک کلب، ۱۹۷۱ء، ص:۱۲
۱۹۔ مختار صدیقی، (مترجم)، جینے کا قرینہ، از آندرے موروا، لاہور، مکتبہ جدید، ۲۰۱۲ء، ص:۸۳
۲۰۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، مختار صدیقی: نوکلاسیکی روایت کا ترجمان، ص:۵۸
۲۱۔ آندرے موروا، جینے کا قرینہ، مترجم: مختار صدیقی، ص:۸
۲۲۔ ایضاً، ص:۹۷
۲۳۔ ایضاً، ص:۱۵۲
۲۴۔ عابد علی عابد، سیّد (مترجم)، داستانِ فلسفہ، از وِل ڈیورانٹ، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء، ص:۱۷
۲۵۔ ایم۔ خالد فیاض، مختار صدیقی کے علمی تراجم: ایک مکالمہ، بمقام: میر ٹرسٹ لائبریری، گجرات، بتاریخ: ۲۲ نومبر ۲۰۲۲ء

References in Roman Script:

1. Jilani Kamran, Professor,Tarjmumay ki Zarorat, (Mashmola),Tarajuma: Riwait aur Fun, Muratab: Dr. Nisar Ahmad Qureshi, Islamabad, Muqtadra Qaumi Language, 1985, p.23
2. Amitav Ghosh, "Indian Express", March 20, 1994, Quoted by Bijay Kumar Das, "A Handbook of Translation Studies", New Delhi, Atlantic Publishers, 2005, Page:80
3. Paul Engle, "Foreward, Writing from World War 11", Iowa University Press, 1985, Quoted by Bijay Kumar Das, "A Handbook of Translation Studies", New Delhi, Atlantic Publishers, 2005, Page:109
4. Farooqi,shams-ur-rehman,Daryaft aur Bazyaft,(Mashmoola),Fun e Tarjuma kari,Muratab,Dr.Safder Rasheed,Islamabad,Porab Academy,2015,p:28

5. Hamid Baig,Doctor,Urdu mei Tarjumy ki riwayat,(Mashmoola),Tarjuma ka Fun aur Riwayat,Muratab:Dr.Qamar Raees,Ali Garh,Educational book House,2004,P:191
6. Humaira Ishfaq,Doctor,Mukhtar Siddiqi:No Clasiciyat Riwayat Ka Tarjuman,Lahore,Sang e Meel Publications,2012,P:8
7. M Khalid Fayyaz,Mukhtar Siddiqi k ilmi Tarajum:ak mukalma,Al mir Trust Library,Gujrat,2022
8. Mukhtar Siddiqi,(Mutrajim),Jeeny ki Ahmiyat,Azlin youtang,Islamabad,National book foundation,2019,P:506
9. Inam ul Haq Javed,Doctor,Paish Guftar,(Mashmoola),Ezan,P:9
10. Mukhtar Siddiqi,(Mutrajim),Jeeny ki Ahmiyat,Azlin youtang,Islamabad,National book foundation,2019,P:11
11. Humaira Ishfaq,Doctor,Mukhtar Siddiqi:No Clasiciyat Riwayat Ka Tarjuman,Lahore,Sang-e-Meel Publications,2012,P:66,67
12. Mukhtar Siddiqi,(Mutrajim),Jeeny ki Ahmiyat,Azlin youtang,Islamabad,National book foundation,2019,P:36,37
13. Ibid,P:32
14. Ibid,P:501
15. Ibid,P:502
16. Ibid,P:514
17. Humaira Ishfaq,Doctor,Mukhtar Siddiqi:No Clasiciyat Riwayat Ka Tarjuman,Lahore,Sang e Meel Publications,2012,P:59,60
18. Jameel Jalibi,Doctor,Eliat k Mazameen,Karachi,Writers Club,1971,P:12
19. Mukhrat Siddiqi,(Mutrajim),Jeeny ka Qareena,Az Andray Morwa,Lahore,Maktaba Jadeed,2012,P:83
20. Humaira Ishfaq,Doctor,Mukhtar Siddiqi:No Clasiciyat Riwayat Ka Tarjuman,Lahore,Sang e Meel Publications,2012,P:85
21. Mukhrat Siddiqi,(Mutrajim),Jeeny ka Qareena,Az Andray Morwa,Lahore,Maktaba Jadeed,2012,P:8
22. Ibid,P:79
23. Ibid,P:152
24. Abid Ali Abid,Syed(Mutrajim),Dastan-e-Falsfa,az Wil Deorant,Lahore,Fiction House,P:17
25. M Khalid Fayyaz,Mukhtar Siddiqi k ilmi Tarajum:ak mukalma,Al mir Trust Library,Gujrat,2022